# ترقی پسند تحریک کی مجلّاتی صحافت: ایک جائزہ (۱۹۳۶ء تا ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر حمیرا اشفاق، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

## Abstract

The study deals with official urdu journals of progressive writers association (PWA) have been appeared since 1936, the year when PWA was established. The journals which started before partition and continued till post-independant years continued, were adab-e lateef "savera' (Lahore) and 'Naya Adab(Mumbai).The analyses reflect the various trends and themes of progressive Urdu litrrature from Peshawar to Mumbai.It also reflects the voices of descent with in the movement.Adab-E-Lateef and 'Savera' fell in serious and conflicting ideological debated during early 1950s.

انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کو پچھتر برس گزر چکے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کا پون صدی کا یہ سفر کئی پہلوؤں سے اہم اور قابل توجہ ہے۔ اس موضوع پر درجن بھر سے زائد کتابیں سامنے آ چکی ہیں اور ان میں تحریک کے مختلف حوالوں سے سوالات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تاریخ پر مبنی درجنوں کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن لمحہ بہ لمحہ تاریخ رقم کرنے والے ادبی مجلّوں کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جب ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا باضابطہ افتتاح ہوا تو بعض اخبارات کے علاوہ لاہور سے شائع ہونے والا جریدہ ''ادب لطیف'' موجود تو تھا لیکن اسے انجمن کی سرگرمیوں کے ساتھ جڑنے میں تھوڑا وقت لگا۔ لیکن جب ایک بار اس نے ترقی پسند ادب کی ڈگر اپنالی تو پھر یہ انجمن کا باضابطہ ترجمان بن گیا اور اس راستے پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

ترقی پسند ادب کے لیے ''ادب لطیف'' اور اس کے بعد نکلنے والے رسائل و جرائد کا تفصیلی ذکر تو آگے چل کر آئے گا لیکن یہاں یہ سوال بھی قابلِ غور ہے کہ ان ادبی جرائد کی ترقی پسندی کو آخر موضوع کیوں نہ بنایا گیا؟ اس بحث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مختلف ادوار میں نکلنے والے پرچوں اور ان کے دورانیے کا مختصراً جائزہ لیں۔ ہم نے 'ادب لطیف' کا ذکر کیا ہے، جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل سے بھی ایک

سال قبل ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا۔ اور ۱۹۳۶ء سے ہی اس میں شائع ہونے والی اکثر تخلیقات ترقی پسند رجحانات کو ظاہر کرنے لگیں۔ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا اور ۴۰۔۱۹۳۹ء کے سالنامے میں کہا گیا: ''زیرِنظر سالنامے کا بیشتر حصہ ان مضامین نظم ونثر پر مشتمل ہے، جو ترقی پسندانہ رجحانات لیے ہوئے ہیں۔'' (۱)

یہ پرچہ میرزا ادیب کی ادارت میں ۱۹۴۱ء تک کامیابی سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۹ء تک فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، قتیل شفائی، فکر تونسوی اور عارف عبدالمتین مختصر وقفوں کے دوران ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ یہ عظیم تبدیلیوں کا دور تھا۔ 'ادب لطیف' اب تک ترقی پسند ادب کے سیاسی پہلوؤں سے الگ تھلک رہا تھا۔ جبکہ کوئی دوسرا مجلّہ ترقی پسند ادب کی ترجمانی کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جب انجمن کا قیام عمل میں آیا اس وقت کمیونسٹ پارٹی سختیوں اور پابندیوں کے دور سے گزر رہی تھی۔ سپین کی خانہ جنگی ۳۹۔۱۹۳۶ء کے دوران ہسپانوی، جمہوریہ کو بچانے کے لیے ادیبوں نے قلم چھوڑ کر بندوق اٹھالی تھی۔ بین الاقوامی ادیبوں کے اس امن بریگیڈ نے ہندوستانی ادیبوں پر بھی انتہائی گہرے اثرات کیے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو اُردو کے ترقی پسند اہل قلم نے سوویت یونین کی ہمنوائی میں اسے سامراجی جنگ قرار دیا لیکن جب ۱۹۴۱ء میں ہٹلر کے جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تو سوویت یونین کو اپنے دفاع میں فاشزم کے خلاف عالمی اتحاد کا حصہ بننا پڑا۔ اس کے ہندوستان پر بھی دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اسے عوامی جنگ قرار دیا۔ پارٹی پر سے پابندیاں اٹھالی گئیں اور یوں ترقی پسندوں کو پہلی بار کھل کر اپنی سرگرمیوں کے اظہار کا موقع ملا۔ ''سنگ میل'' کا یہ دور فیض، بیدی اور فکر تونسوی جیسے ترقی پسند ادیبوں کی ادارت کا دور ہے۔ فروری ۱۹۴۲ء کے اداریے میں صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے فیض نے کہا:

> ''آج سے بہت عرصہ پہلے جب سماج ایک معین اور یکساں نظام کے ماتحت تھی۔ اس کا ادب بھی ایک ٹھہرے ہوئے دریا کی کیفیت رکھتا تھا۔ جس کے موضوعات اور اسالیب چند بندھے ہوئے قوانین کی پیروی کرتے تھے۔ سماج کا پرانا نظام ٹوٹ پھوٹ چکا اور نیا نظام شرمندہ تشکیل ہونے سے پہلے آمادہ زوال نظر آتا ہے۔ یہی تزلزل اور بے یقینی جو ہمارے خارجی ماحول میں ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کے افکار و اشعار پر بھی مسلط ہے۔ ان میں پرانے نظام اخلاق و معاشرت کے نام لیوا بھی ہیں۔ نئی اقدار کے ترجمان بھی، قنوطی اور فراری بھی ہیں۔ خود اعتماد اور حقیقت پسند بھی، رجعت پسند بھی ہیں ترقی پسند بھی، ہمارے تنقیدی نظریے بھی انہیں مقناطیس رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اگر ایک نقاد کی نظر میں ادب کا مقصد محض تفریحی ہے تو دوسرے کے خیال میں ادب کی افادی مقاصد سے علیحدہ کرنا ناپسندیدہ بھی ہے اور غلط بھی۔ لیکن یہ مختلف اور متناقص رجحانات یکساں طور پر اہم اور توانا

نہیں ہیں، یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ ان میں سے کون شباب کے پہلے مرحلہ میں ہے اور کون پیری کی آخری منزل میں ایک ادبی ماہانہ جو آزادی گفتار کا قائل ہے اپنے جریم کا دروازہ سب پر کھلا رکھتا ہے۔ زائرین کی تعداد اور ان کی حرکات خود اس بات کی شاہد ہیں کہ وقت اور ہجوم کا رخ کس طرف ہے۔ ادب لطیف میں بھی ہم حسب وسعت ہمعصر ادب کی مجموعی شکل و صورت پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں اور اگر یہ صورت بعض اصحاب کی نظر میں پسندیدہ نہیں تو ہمیں ان سے ہمدردی ہے وہ یا اپنے وقت سے بہت پیچھے ہیں یا بہت آگے وہ ادب لطیف یا موجودہ دور کے کسی اور نمائندہ مجلّہ سے برسرپیکار نہیں اپنے ماحول سے جنگ میں مصروف ہیں۔'' (۲)

اس عصری تجزیے کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے ترقی پسند تحریک کے آغاز کو حالی اور آزاد کے بعد کی دوسری بغاوت قرار دیا اور انہوں نے لکھا:

''آج سے قریباً سات برس پہلے چند نوجوان ادیبوں نے ترقی پسند کے عنوان سے ایک تحریک شروع کی جس کا بنیادی مقصد ادب کو مروجہ رومانیت اور خیال پرستی کے بجائے زندگی اور واقعیت کی طرف مائل کرنا تھا۔ حالی اور آزادی کے زمانہ کے بعد ادب کی مروجہ رسوم کے خلاف یہ دوسری اہم بغاوت ہے۔ اس کی توانائی کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ اس مختصر سے عرصہ میں یہ تحریک ہماری ادب کے قریباً ہر شعبہ کا مستقل جزو بن چکی ہے اور دوسرا ثبوت یہ کہ آج تک ہمارے ادب میں غالباً کسی نظریے، کسی مصنف اور کسی تحریک کی اس شدت سے حمایت کا مخالفت نہیں ہوئی۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ کوئی مسئلہ کچھ دنوں موضوع بحث رہا فریقین نے اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور معاملہ طے ہو نہ ہو ختم ضرور ہو گیا لیکن ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا مسئلہ ایک مسلسل آویزش کی صورت اختیار کر چکا ہے اور ایسے بنیادی مسئلے کے متعلق ایسا ہونا بھی چاہیے۔'' (۳)

یہ اور اس طرح کے مباحث اگلے چند برسوں تک جاری رہے۔ 'ادب لطیف' ۱۹۴۵ء کے سالنامہ میں 'معروضات' کے عنوان سے کرشن چندر کا تفصیلی مضمون شائع ہوا جو دراصل ان کی مرتبہ کتاب ''نئے زاویے'' جلد دوم کا دیباچہ تھا۔ اس سے بحث کے نئے در وا ہوئے۔

اس دیباچے میں انہوں نے سامراجی جنگ سے عوامی جنگ کے آخری مراحل اور دیگر سماجی شعبوں سے کھل کر بحث کی۔ نئے جنسی ادب پر تفصیلی گفتگو ہوئی اور ترقی پسند ادب کا زبان، تاریخ، سائنس جغرافیہ اور معاشیات کے حوالے سے جو مخصوص نقطۂ نگاہ ہے، اس پر کئی سوالات سامنے آئے۔ اس سوال پر بھی بحث کی گئی کہ ادب میں مزدوروں اور کسانوں کی ترجمانی کے لیے کیا کسی مزدور کسان ادیب کو ہی آنا پڑے گا؟ کرشن

چندر نے نتیجہ اخذ کیا کہ ''نئے ادب میں بلاشبہ طربیہ عناصر کی کمی ہے، اس کی شاعری نشاطیہ نہیں، اس کے نثری کارنامے مسرت آگیں نہیں بلکہ ایک مغموم تابندگی کے مظہر ہیں۔۔۔لیکن اگر آپ نئے ادب کا بنظر غائر مطالعہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ آنکھ محض یاس و نکبت کے مناظر نہیں دیکھتی بلکہ ان تاریک گھٹاؤں کے پرے اُفق پر اس چاندی کی لکیر کو بھی دیکھ رہی ہے جو زندگی کے لیے ایک نئی راہ ہے۔'' (۴) یہ امید، یہ رجائیت ایک نئی جدوجہد، ایک نئے طرزِ عمل کی طرف اشارہ تھی۔ اسی شمارے میں مسعود زاہدی نے ''ترقی پسند ادب'' کے عنوان سے یہ کہنے کی کوشش کی کہ ''ترقی پسند ادیب کا مقصد اولیٰ لسانی انقلاب پیدا کرنا ہے جو حکومتی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکے گا۔ ترقی پسند ادب کا جو ہر عام انسانی مسرت کے حصول کی جدوجہد ہے۔'' (۵) یہ ادیب سماجی اور نفسیاتی آزادی کا نقیب ہے۔ یہ مصنوعی اور جھوٹی قدروں کو رد کرتا ہے۔

۱۹۴۵ء میں، جب ''ادب لطیف'' کی عمر دس برس ہو رہی تھی، بمبئی (موجودہ ممبئی) سے دو ماہی ''نیا ادب'' کا اجراء ہوا جسے ترتیب دینے والوں میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے نام شامل تھے۔ قلمی معاونین میں سجاد ظہیر، سبط حسن، ساحر، ظہیر کاشمیری، غلام ربانی تاباں، جاں نثار اختر، ہنسراج رہبر، اوپندر ناتھ اشک، سید ممتاز حسین، حبیب تنویر، فارغ بخاری، فکر تونسوی، راجندر سنگھ بیدی، جوش، احمد ریاض، شاکر علی، اختر الایمان اور احمد ندیم قاسمی سمیت درجنوں نام شامل تھے۔ ۴۸۔۱۹۴۵ء کے درمیانی برسوں میں کیفی اعظمی کا ''ترقی پسند ادب کیا نہیں ہے؟'' شاکر علی کا ''سوویت آرٹ اور مصور'' سجاد ظہیر کا ''اردو، ہندی اور ہندوستانی'' کرشن چندر کا ''نئی قدریں'' اور ممتاز حسین کا ''ادبی قدریں کیا ہیں؟'' جیسے بنیادی نوعیت نظریاتی مقالات شائع ہوئے۔ بمبئی انجمن جمہوریت پسند مصنفین کا ہیڈکوارٹر تھا۔ یہاں درجنوں ادیب اور شاعر جمع ہو گئے۔

''نیا ادب'' کا اداریہ ''حرف آغاز'' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا جو چاروں مدیران کی اجتماعی کاوش ہوتا۔ ان شماروں میں ترقی پسند شعر و افسانہ نے بھی خوب جگہ بنائی۔ اس کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا ''ترقی پسند مصنفین کی دو ماہی کتاب''۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں یہ ماہنامہ بن گیا۔ ۱۹۴۵ء میں اپنے آغاز سے ہی ''نیا ادب'' نے علی الاعلان ترقی پسند تحریک کی تائید و ترویج کا بیڑہ اٹھایا۔ دوسرے شمارے کے اداریے میں مدیران نے اپنی جانبداری کا اعلان کر دیا۔ ان کے بقول:

> ''انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۳۶ میں پڑی اور مخالفت بھی اسی وقت سے شروع ہوئی جو پچھلے تین چار سال میں جنون سے بدل گئی۔ مخالفین کا پراپیگنڈہ یہ بھی تھا کہ یہ تحریک ''چند مغرب زدہ ناتراشیدہ لونڈوں'' کی تحریک ہے، لیکن کانفرنس میں شریک تھے، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تارا چند، سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار، مولوی علی اختر، ڈاکٹر زور، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر احتشام حسین، مولوی اکبر وفا قاتی، ملک راج

آنند، مدن گوپال اور سجاد ظہیر وغیرہ۔''(۵)

'حرف آغاز' ہی کے مطابق اسی سال ۱۴ سے ۱۷/ اکتوبر ۱۹۴۵ء تک، حیدرآباد دکن میں اُردو کے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کی مختصر روداد اداریے میں شامل کی گئی ہے۔ جس کے مطابق کرشن چندر، سجاد ظہیر، فراق گورکھپوری، سبط حسن، سردار جعفری اور ساحر لدھیانی نے پرمغز مقالے پیش کیے۔ یہ مقالے ادب، آرٹ، اُردو شاعری، اُردو صحافت، اقبال اور جنگ اور نظم کے موضوعات کا احاطہ کرتے تھے اور الگ الگ موضوعات ہونے کے باوجود ان میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ اپنے کلچر اور ادب کے تمام مسائل کو حل کرنے کی کوشش تھی۔ مختلف قراردادوں کے ذریعے انجمن میں دیگر فنون سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کی شرکت، فلم اور صحافت کی اصلاح اور سال کی بہترین تصنیف پر ساڑھے تین سو روپئے کا غالب انعام دینے کا اعلان کیا گیا:

> ''یہ تجویزیں اس تغیر و انقلاب کا اظہار ہیں آج دنیا جن سے گزر رہی ہے۔ اس عہد شکست و ریخت میں ہر ایسی چیز فنا ہو جائے گی، جس میں بدلنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اگر ہمارے ادب، آرٹ، فلم اور صحافت کو زندہ رہنا اور ترقی کرنا ہے تو ان کو نئے سانچے میں ڈھلنا پڑے گا۔''(۶)

۱۹۴۶ء میں ہندوستان بھر میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ بنگال، بہار، یوپی اور بمبئی بری طرح ان کی لپیٹ میں آ گئے۔ اب تک جو ہندو اور مسلمان انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، وہ خونی ہتھیاروں کے ساتھ، ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ اگر ایک طرف غنڈہ اور بدترین سماجی عناصر چاروں طرف آگ لگا رہے تھے تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے، جو انسانی محبت اور بھائی چارے کی حفاظت کر رہے تھے۔ اخبارات میں سیاسی جماعتیں، ایک دوسرے پر الزام لگا رہی اور اس آگ کو مزید بھڑکا رہی تھیں۔۔ اس موقع پر دو ماہی ''نیا ادب'' نے جو اداریہ لکھا، اس پر چاروں مرتبین۔۔ کرشن چندر، احمد عباس، کیفی اعظمی اور سردار جعفری۔۔ نے اپنے دستخط کیے۔ اداریہ میں کہا گیا کہ:

''اس خانہ جنگی کی آگ میں وہ بہترین قدریں جل کر خاک ہو رہی ہیں جن پر تہذیب، تمدن، ادب اور فن کی بنیادیں قائم ہیں۔ عورتیں نرم دل سمجھی جاتی ہے۔ بچے معصوم ہوتے ہیں لیکن اب کی بار برادر کشی میں انہوں نے بھی حصہ لیا ہے۔ اس فساد میں جو روح فرسا اور ہولناک مناظر دیکھیے گئے ہیں۔ ان کی مثال ذرا شکل سے ملے گی۔ لاشوں کی نمائش کی گئی۔ کٹے ہوئے سر جلوس کے ساتھ نیزوں اور تلواروں پر بلند کیے گئے۔ بچوں کی نعشوں کو کیلوں سے ٹھوک کر عبرت کے لیے لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد بھی ہندو اور مسلم اخبارات اور سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کو الزام دیتی رہیں۔ اگر باہمی نفرت کی اس آگ کو فوراً نہ بجھایا گیا تو ہم اپنی آنے والی نسلوں کے لیے کوئی اچھا سرمایہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہندوستان، گوتم بدھ اور نانک کا ہندوستان،

کالیداس ٹیگور اور اقبال کا ہندوستان، ٹیپو اور بھگت سنگھ کا ہندوستان، شبلی اور محمد علی کا ہندوستان، خاکستر کا ایک ڈھیر ہوگا۔'' (۷)

اس موقع پر ہندوستان بھر کے ترقی پسند ادیبوں نے اپنے دستخطوں سے ایک طویل بیان جاری کیا۔ اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں اُردو، سندھی، پنجابی، بنگالی، گجراتی، ہندی اور ہندوستان کی دیگر کئی زبانوں کے ادیب شامل تھے۔ سید سجاد ظہیر، جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، اسرار الحق حجاز، اوپندر ناتھ اشک، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، علی سردار جعفری، ابراہیم جلیس، قدوس صہبائی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانی، رام بلاس شرما، رمیش سنہا، بھوگی لال گاندھی، بشنو ڈے، میلا جانند مکرجی اور مانک بینرجی سمیت درجنوں ترقی پسند ادیبوں نے اس بیان پر دستخط کیے یہ بیان تاریخ اہمیت کی حامل ایک دستاویز ہے۔ درج ذیل اقتباس سے بیان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ''ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس نازک دور میں فرقہ پرستی اور اس کے تمام مظاہر کے خلاف جہاد کریں اور کوشش کریں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تلخیاں نہ پیدا ہونے پائیں اور ہندوستانیوں کی باہمی کشیدگی اور زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ ہم اس فرض کو صرف اس طرح انجام نہیں دے سکتے کہ اپنے اہل وطن سے انسانیت اور حب الوطنی کے نام پر اپیل کریں اور سامراج کی مہلک سیاست کا پردہ چاک کریں بلکہ ہم ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ عوام کی مشترکہ جدوجہد اور زندگی سے اتحاد، محبت اور بھائی چارج کی بہترین مثالوں کو ادبی اور فنی شاہ پاروں کی شکل میں پیش کریں۔ ہم نے کلکتے اور بمبئی میں یہ دیکھا ہے کہ منظّم مزدور طبقہ نہ محض فرقہ وارانہ فساد اور قتل و غارت کے شعلوں سے بچا رہا بلکہ ہندو اور مسلم مزدوروں نے مل کر ان قوم دشمن عناصر کے خلاف عملی جدوجہد کی جن کا ضمیر مر چکا تھا اور جن کی انسانیت اور حب الوطنی کے جذبات سڑ چکے تھے۔ ایسی مثالیں درمیانی طبقے میں بھی نظر آتی ہیں کہ انہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے بھائیوں کی حفاظت کی اور اس طرح اتحاد کے جذبے کو تقویت پہنچائی۔ ہمیں یقین ہے کہ سامراج کی تمام اشتعال انگیزی اور قومی رہنماؤں کی ساری ناکارہ سیاست کے باوجود باہمی نفرت، نفاق، فساد اور خانہ جنگی کے شعلے، عوام کی باہمی محبت، اتحاد اور حب الوطنی کے بڑھتے ہوئے دھارے سے بجھ جائیں گے۔ موت اور غلامی کو شکست ہوگی اور زندگی اور آزادی کو فتح نصیب ہوگی۔'' (۸)

۱۹۴۶ء میں ہی ترقی پسند ادب کا ایک اور ترجمان ''سویرا'' لاہور سے جاری ہوا۔ اس کی پیشانی پر درج تھا۔ ''جدید فن کاروں کے خیالات کا سلسلہ'' اور مدیران میں احمد ندیم قاسمی، نذیر چودھری اور فکر تونسوی

کے نام تھے۔۔ نذیر چودھری اب چودھری برکت علی کے ساتھ ''ادب لـــــطیف '' چلا رہے تھے لیکن بعض اختلافات کی بنیاد پر وہ مکتبہء اُردو اور ''ادب لـــــطیف '' سے الگ ہوگئے اور ''نیا ادارہ'' کے زیر اہتمام ''ســویـرا'' کا اجراء کیا۔ چودھری نذیر 'ادب لـطیف' سے کیوں الگ ہوئے، کیا یہ کاروباری اختلاف تھا یا اس کی بنیاد نظریاتی تھی؟ انور سدید نے عارف عبدالمتین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء کے وسط میں ''ادب لطیف '' کی بلند اور مضبوط عمارت میں چند رخنے پیدا ہوگئے جو داخلی نوعیت کے تھے چنانچہ ''ادب لطیف '' کے انتظامی معاون چودھری نذیر احمد اور ادارتی معاونین قتیل شفائی اور فکر تونسوی نے علیحدگی اختیار کر لی۔ (۹) اس بیان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ داخلی نوعیت کے وہ رخنے کیا تھے۔

چودھری نذیر احمد کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ چوہدری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کے اختلافات نظریاتی تھے۔ ادب لطیف کی نظریاتی سمت واضح طور پر ترقی پسندوں کی جانب تھی۔ اس لیے حکومت کے دباؤ کی تلوار ہر وقت لٹکتی رہتی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں میرزا ادیب کے دورِ ادارت میں دو ہزار روپے کی زرِضمانت بھی جمع کرانی پڑی تھی حالانکہ میرزا ادیب خاصے معتدل مدیر تھے اور انہوں نے اپنے اداریے میں واضح بھی کیا تھا کہ 'ادب لطیف' خالص ادبی رسالہ ہے اور اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں لیکن ۱۹۴۶ء میں فکر تونسوی جیسے نظریاتی مدیر کی موجودگی مجلّہ کی بقا کے لیے خطرہ بنتی جارہی تھی۔ چودھری نذیر احمد نے ۱۹۴۶ء میں جب سویرا کا اجراء کیا تو مدیران کی بات چیت (اداریہ) کے بعد ''مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے دوٹوک لفظوں میں کہا:

''ادب لطیف '' کو میں نے رگ جاں سمجھ رکھا تھا اور اس کے لیے فن اور ادب کی نت نئی دنیائیں نت نئے چراغ اور نت نئی منزلیں پیدا کرتا، روشن کرتا اور طے کرتا چلا گیا۔ ہماری دن رات کی تعمیری کوششوں اور ترقی پسند ادیب ساتھیوں کی معاونت سے ادب لطیف کی مشعل روشن سے سے روشن تر ہوتی چلی گئی۔ قانون کی خداوندانہ گرفتیں، ادب کے رجعتی نمائندوں کا طوفان مخالفت اور اپنے سرمایہ دار شریک کار کا مسلسل عدم تعاون۔۔ سبھی کچھ برداشت کیا۔ لیکن اگر برداشت نہ ہوسکا تو صرف دو وقت، جب میرے شریک کار نے میرے بڑھتے ہوئے نظریاتی حوصلوں میں سدراہ بننے کی کوشش کی اور میرے سامنے اپنے آمرانہ مطالبے پیش کیے کہ یا تو اس رسالے کی ادبی پالیسی بدل دو یا اس سے الگ ہوجاؤ۔ میرے دوست میرے اس وقت کے تذبذب کا اندازہ لگا سکتے ہیں جب ایک طرف تو میرا بنیادی نصب العین تھا اور دوسری طرف اپنی ''رگ جاں'' کی مفارقت لیکن میں نے جی کڑا کر کے اپنے نصب العین پر اپنے ادب لطیف کو قربان کر دیا۔ یہ قربانی، تاریخی قربانی ہے تاریخ جو ارتقائی منازل کو آئینہ دکھاتی ہے۔

> ''ســویــرا''۔۔۔ میری نئی رگ جاں ہے اور میں ملک بھر کے ادب نواز اور ادب ساز حلقوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اسے فن کاروں کے جدید تر تجربوں اور اشاعتی محاسن کی

جدید تر قدروں کا وہ یادگار اور مثالی پیکر بنادوں گا جس کے نقوش، ایک مدت تک سرمایہ دارانہ دباؤ نے میرے ذہن کے نہاں خانوں میں بھینچ رکھے تھے۔۔اب میں زیادہ جرات زیادہ خوبصورتی اور زیادہ حوصلے کے ساتھ اپنی دبی گھٹی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کرسکوں گا۔۔اب میں آپ کے اور زیادہ قریب آ گیا ہوں۔''(۱۰)

یہ چودھری نذیر احمد کا وضاحتی بیان بھی ہے اور دو ماہی ''سویرا'' کی ادبی پالیسی بھی۔''سویرا'' کے ابتدائی چند شماروں پر نظر ڈالتے ہی اندارہ ہوجاتا ہے کہ یہ بیان صداقت سے خالی نہیں ہے لیکن ضرورت ہے کہ مدیران (احمد ندیم قاسمی، نذیر چودہری فکر تونسوی کی ''بات چیت'' پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ اداریے میں ادب کی ترقی پسند قدروں کے ذکر سے اجتناب کیا گیا ہے۔ لفاظی کی مدد سے مختلف مجرد بیان دیئے گئے ہیں۔ مثلاً 'یہ کسی معین منزل کی طرف اشارہ نہیں کرتا، یہ اردو کے نئے ادب کی ایک میزان ہوگا، یہ ادیبوں کے کسی خاص گروہ کا نمائندہ نہیں، وغیرہ (۱۱)۔ عجیب بات ہے کہ چودھری نذیر تو ایک نظریاتی پوزیشن لے رہے ہیں جبکہ ''بات چیت'' میں کسی بھی پوزیشن سے اجتناب کیا گیا ہے۔اس بات چیت کے اختتام پر لفظوں کا ایسا گورکھ دھندا پھیلا دیا گیا ہے جس سے کسی واضح موقف یا پوزیشن کا اظہار نہیں ہوتا۔ درج ذیل سطور ہماری بات کو واضح کردیں گی۔

''سویرا ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح پرکھنے والوں پر اپنے نظریات کو نہیں ٹھونسے گا بلکہ چند مشورے پیش کردینے کے بعد ان کے اثرات کا مطالعہ کرے گا۔ اس کی پالیسی نئے ادب کے رجحانات سے ہم آہنگ ہوگی اس کے مندرجات ادیبوں کی جگہ ادبیات سے عبارت ہوں گے اور یہ سڑے بسے مضامین کے متعلق ریاکارانہ انداز میں گرجتی اور گونجتی ہوئی تعریف کرکے ریت کے محل نہیں کھڑے کرے گا،''سویرا'' کے ادارہ کے ان گنت فرائض میں اولین مقام اس عزم کو حاصل ہے کہ ''سویرا'' میں چھپنے والی ہر چیز ایک ایسے امتیاز کی مالک ہو، جو خواص کو جھنجھوڑ دے اور عوام کو چونکا دے۔(۱۱)

اب مجلّہ کے مندرجات پر نظر ڈالی جائے تو صورت حال واضح ہوسکتی ہے چنانچہ پہلے ہی شمارے میں فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، مجید امجد، فکر تونسوی، ظہیر کاشمیری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، مخمور جالندھری، علی سردار جعفری، قتیل شفائی، عبدالمتین عارف، ظہیر کاشمیری، جاں نثار اختر اور دیگر کئی ترقی پسندوں کی منظومات، باری، ظہیر کاشمیری، منٹو، طفیل احمد اور پال رچرڈ کے مقالات، اختر حسین رائے پوری، بیدی، ممتاز مفتی اور اشک کے افسانے ڈرامے اور باری، طفیل احمد اور فکر تونسوی کے تحریر کردہ جائزے شائع کیے گئے۔ دوسرے شمارے میں بھی ظہیر کاشمیری، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، فراق گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری، منٹو، اشک عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، طفیل احمد خان اور عبدالمجید سالک جیسے اہل قلم شامل تھے۔

''سویرا'' کے یہ دونوں شمارے، ہندوستان کی تقسیم سے پہلے شائع ہوئے تھے، جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس پذیرائی کے پیچھے یقیناً ترقی پسند تحریروں کا جادو کام کر رہا تھا لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ چودھری نذیر احمد نے پہلے شمارے میں جس عزم کا اظہار کیا تھا اس پر وہ پوری طرح کاربند رہے تھے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ چودھری نذیر کے 'ادب لطیف' کو چھوڑ کر آنے کے باوجود پرچہ اپنی ترقی پسندانہ ڈگر پر مسلسل آگے بڑھتا رہا اور ۱۹۴۹ء میں اپنی عارضی بندش تک اپنی روش پر قائم رہا بلکہ قیام پاکستان کے بعد اس میں خاصی انتہا پسندی آ گئی۔ اس تمام صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں:

> ''اس ادارتی تبدیلی نے ''ادب لطیف'' کے داخلی مزاج پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا، حتیٰ کہ سابق مدیر قتیل شفائی کی غزل کے علاوہ قتیل شفائی پر فکر تونسوی کا خاکہ ''بھولا بھالا' فروری ۱۹۴۷ء کے پرچے میں شائع ہوا، لکھنے والوں میں بھی کوئی امتیازی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی دور سے پاکستانی دور کی طرف ''ادب لطیف'' کی پیش قدمی ہموار اور متوازن تھی لیکن آزادی کے بعد ترقی پسند ادبا میں انتہا پسندی آ گئی تو اس کی لپیٹ میں ''ادب لطیف'' میں آ گیا ایک تند و تیز تبصرے کی اشاعت پر عارف عبدالمتین صاحب کو چودھری برکت علی نے محتاط ہونے کی گزارش کی تو انہوں نے بقول خود تلخ ہو کر کہا ''میں احتیاط نہیں کر سکتا میں آپ کے ہاں سے جا رہا ہوں'' عارف صاحب نے لکھا کہ ''جب میں چلا گیا تو ''ترقی پسند مصنفین نے ''ادب لطیف'' کا بائیکاٹ کر دیا۔'' (۶۵) اور رسالہ ''استقلال'' پر عارف صاحب کے متذکرہ تبصرے کی وجہ سے ''ادب لطیف'' کی اشاعت پر پابندی لگ گئی۔'' (۱۲)

اگست ۱۹۴۷ء میں بھارت اور پاکستان کے نام سے دو جداگانہ مملکتیں وجود میں آئیں۔ تقسیم کے وقت لاہور سے ''سویرا'' اور ''ادب لطیف'' اور ممبئی سے ''نیا ادب'' نکل رہے تھے جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ تقسیم کے چند ماہ بعد، لاہور سے ہی ماہانہ 'نقوش' پشاور سے 'سنگ میل' اور جالندھر سے دو ماہی 'شاہراہ' کا اجراء ہوا۔ 'نقوش' ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں نکلا۔ 'سنگ میل' کے مدیران میں فارغ بخاری، رضا ہمدانی، قتیل شفائی اور خاطر غزنوی کے نام شامل تھے۔ شاہراہ کے پہلے مدیر ساحر لدھیانوی تھے جو ۱۹۴۸ء میں لاہور چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے بقول:

> ''ساحر لدھیانوی کے لاہور سے آنے کے بعد یوسف جامعی نے ماہنامہ ''شاہراہ کی شروعات کی تو ساحر لدھیانوی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رسالے کا زیادہ تر کام پرکاش پنڈت ہی کرتے تھے مگر جب پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ بحیثیت مدیران کے جگری دوست رام پرکاش اشک کا نام دیا گیا تھا۔ پرکاش پنڈت کو اس کا بڑا دکھ

ہوا اور اس کی شکایت انہوں نے کئی دوستوں سے بھی کی بہرحال جب ساحر بمبئی (ممبئی) چلے گئے تو انہیں اس رسالے کی ادارت سونپ دی گئی۔'' (۱۳)

اب ہندوستان اور پاکستان سے ترقی پسند ادب کے چھ ترجمان رسالے باقاعدہ سے شائع ہو رہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ''سویرا'' کا جو پہلا شمارہ نکلا، اس کے سرورق پر ''جدید فنکاروں کے خیالات کا سلسلہ'' کی بجائے ''ترقی پسند فنکاروں کی تخلیقات کا ترجمان'' تحریر کیا گیا۔ شمارہ نمبر ۴۰ میں اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے ادب کی ترقی پسند تحریک کا ترجمان کے الفاظ درج کیے گئے اور شمارہ ۱۴۔۱۳ تک اسی طرح لکھے جاتے رہے۔ حتیٰ کہ احمد راہی کی ادارت ختم کر کے اس کی ادارت حنیف رامے کے سپرد کر دی گئی اور یہ سرکاری طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا ترجمان نہ رہا۔ تب بھی اس پر یہی الفاظ درج تھے۔ یہ شمارہ ۱۶۔۱۵ میں ''ادب لطیف'' سے الگ ہوتے ہوئے چودھری نذیر احمد نے ''سویرا'' کا اجراء کیا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد پرچے کی ضبطی اور دیگر مشکلات کے باعث وہ زیادہ عرصہ تک ترقی پسندوں کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے چنانچہ شمارہ ۱۵ سے انہوں نے ترقی پسندوں کو الگ کرنے کے بعد تقریباً وہی کردار ادا کیا، جس کی شکایت انہیں ۱۹۴۶ء میں چوہدری برکت علی سے پیدا ہوئی تھی، ہوسکتا ہے اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہوں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۹ء (شمارہ ۸۔۷) میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی پہلی کل پاکستان کانفرنس میں ''ادب برائے انقلاب'' کا نعرہ لگایا تو حکومت نے اسے ایک ''سیاسی جماعت'' قرار دے کر اس کے دفتر اور ممبروں کے مکانوں پر چھاپے مارے اور کئی ادیبوں کو گرفتار کر لیا۔ شاید چوہدری نذیر احمد کو ترقی پسند ادبی تحریک کی ترجمانی کا بوجھ زیادہ محسوس ہونے لگا ہو۔ یہی نہیں، اسی شمارے میں احمد ندیم قاسمی کا مقالہ ادارہ ''ادب لطیف جواب دے'' شائع ہوا۔

اس موقع پر ''ادب لطیف'' نے کانفرنس کے مندوبین پر شدید حملے کیے۔ کہا گیا کہ ترقی پسندی کی تحریک بنیادی طور پر ادبی تحریک ہے۔ اس لیے ادب کی شاہراہ سے الگ ہو کر سیاست کے خارزاروں میں قدم رکھنا اس کا مسلک نہیں۔ (۱۶) ادب لطیف نے رجعت پسند رسالوں، اخباروں اور ادیبوں کے بائیکاٹ پر بھی تنقید کی۔ ''سویرا'' میں احمد ندیم قاسمی نے ان دونوں باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا کہ ''ادب لطیف'' کے اعتراضات کی بنیاد یہ ہے کہ ''وہ ادب اور سیاست کے رشتے کو قبول نہیں کرتا۔'' (۱۵) اس شمارے کی ادارت ظہیر کاشمیری، احمد راہی اور عارف عبدالمتین کے ذمہ تھی۔ اس سے قبل تیسرے شمارے کی ادارت احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانی اور نذیر چوہدری جبکہ چوتھے شمارے کی ادارت کے فرائض ساحر لدھیانوی اور نذیر چوہدری ادا کر رہے تھے۔

جون ۱۹۴۸ء میں ساحر لدھیانوی کو ہراساں کر کے ملک سے نکالنے کی تحریک شدت اختیار کر گئی۔ ''شورش کاشمیری حکومت کے ایماء پر ساحر کا دوست بن کر انہیں پیار سے ترغیب دیتے تھے کہ اس ملک سے بچ